کلاؤن (فکر تونسوی)

خالد اختر، محمد

میں سن کے بارے میں تیقن سے نہیں کہہ سکتا مگر یاد پڑتا ہے کہ غالباً یہ ۱۹۴۲ء کی برکت کا سال تھا کہ میں فکر تونسوی کے نام سے پہلے پہل آشنا ہوا۔ میں ان دنوں میکلیگن انجینئرنگ کالج میں پڑھتا تھا (پڑھنا کچھ مبالغہ ہے کیونکہ بیشتر وقت میں کلاس سے بھاگا رہتا تھا) اور ادب لطیف، سویرا اور دوسرے ادبی پرچوں کا پُراشتیاق قاری تھا۔ اس وقت تک میں نے اردو میں کچھ نہیں لکھا تھا ماسوا ایک مزاحیہ خاکے کے جسے میرے دوست احمد ندیم قاسمی کی سفارش پر چراغ حسن حسرت نے اپنے ہفتہ وار مزاحیہ پرچے 'شیرازہ' میں چھاپا اور ایک کہانی 'لالٹین' جسے کوئی چھاپنے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ بیس سال بعد فنون میں چھپی کیونکہ اس کے زرد یائے ہوئے پرزے مجھے حسن اتفاق سے اپنے پرانے کاٹھ کباڑ میں مل گئے تھے۔ ان دنوں میری سب سے بڑی تمنا اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھنے کی تھی۔ میں نے فکر کے طنزیے پڑھے اور رشک سے میرا جی گھٹنے لگا۔ انہی دنوں اس کی شاعری کی کتاب 'ہیولے' چھپی۔ میں نے اسے خریدا لیکن تفصیل سے اسے پڑھا نہیں۔ اچھا تو یہ فکر صاحب شاعر بھی تھے۔ اردو میں جدید معرّا شاعری کی ریت ن۔ م۔ راشد نے ڈالی تھی۔ اس کی پہلی کتاب 'ماورا' کے لیے کرشن چندر نے ایک مفصل پیش لفظ لکھا اور کیونکہ وہ بے چارہ افسانہ نگار تھا (اور میرا خیال ہے) جدید معرّا شاعری کی دو کوڑی بھی پروا نہیں کرتا تھا اس لیے اُس نے اس میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ یا ایسے ہی آندرے گارڈلے، شاعری کے نقاد کی تنقیدی کتاب سے ٹکڑے ٹکڑے اردو قالب میں ڈھال کر اپنے دوست کو خوش کرنے کے لیے نقل کر دیے جن کا بعد میں پتہ چل گیا۔ کرشن چندر نے اقبال جرم کیا۔ اپنی بے حد شیریں اور دھیمی مسکراہٹ سے اس کارکردگی کی عذرداری میں کہا کہ وہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

اس کے بعد اس نے ٹھوس تنقید کے میدان کو اپنے لیے ممنوعہ علاقہ سمجھا۔ ایک بھی تنقید نہ

لکھی۔ 'ماورا' پر اگرچہ لے دے بھی بہت ہوئی مگر نوجوان نسل میں اس نے جدید شاعری کرنے کا سودا پیدا کر دیا۔ جدید معرّا نظمیں دھڑا دھڑ لکھی جانے اور چھپنے لگیں۔ یہ شاعری اتنی آسان تھی۔ فکر کی 'ہیولے' شاید اولین نظم کی کتابوں میں سے تھی جو ن۔ م۔ راشد کے تتبع میں لکھی گئی۔ میں نے فکر کی کتاب کو خرید اضرور مگر دو تین نظمیں پڑھ کر بدک گیا۔ سچ یہ ہے کہ انگریزی اور اردو کلاسیکی شاعری کو پڑھتے رہنے سے شاعری کے متعلق چند تعصبات ہیں۔ اس میں موسیقی ہونی چاہیے (جو بحروں اور قافیہ ردیف کے بغیر نہیں آتی) اور جادو کا عنصر۔ ٹی ایس ایلیٹ اور ایزرا پاؤنڈ کو بھی کبھی نہیں پڑھ سکا اگرچہ میرے ایک دوست کو ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کے بند کے بند یاد ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ نظموں کی اس کتاب سے ادب کی دنیا پر سکہ جمانے کے بعد فکر نے مزید جدید نظمیں لکھنے سے توبہ کیوں کر لی۔ میں نہیں جانتا کہ آیا بھارت جا کر اس نے اس صنف میں کچھ معرکے سر کیے ہیں۔

فکر کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین چھپتے رہے اور تقسیم سے پہلے ہی بحیثیت طنز نگار اس کا نام کنہیا لال کپور کے ساتھ لیا جانے لگا۔ کنہیا لال کپور میرا چہیتا تھا اور اب بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ اردو زبان میں خالصتاً اعلیٰ معیار کی طنزیہ تحریروں (مغربی ادب کے ڈھب پر) کی داغ بیل کپور نے ڈالی۔ اس سے پہلے بڑے بڑے مزاح نگار ضرور پیدا ہوئے۔ رتن ناتھ سرشار سے لے کر عظیم بیگ چغتائی، پطرس اور شفیق الرحمٰن تک، مگر طنز لکھنے والا ایک بھی نہیں۔ دیکھو تو ہر دور اور ہر ادب میں طنز نگار بہت تھوڑے آئے ہیں۔ انگریزی ادب جو ساری ادبی اصناف میں بے حد دولت مند ہے، طنز کے باب میں اس میں چند ہی گنے چنے نام ابھرتے ہیں۔ ڈین سوفٹ، جین آسٹن، تھیکرے، ایولن واہ (جو ڈین سوفٹ سے بھی زیادہ تند اور کڑوا ہے) اور انیمل فارم کا جارج آرویل۔ فرانس میں والٹیر نے دو مشہور عالم کتابیں لکھیں۔ کینڈڈ اور زاڈک جن میں طنز کا فن (یہ میری اپنی رائے ہے) اپنی معراج کو چھوتا ہے۔ خالص طنز نگاروں کی قلت اور اقلیت کا سبب کیا ہے؟ اس بارے میں میری اپنی ایک تھیوری کو ذرا کھول کر بیان کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ہاں۔ چوتھی دہائی میں لے دے کر اردو میں دو ہی معیاری طنز نگار تھے۔ کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی۔ کنہیا لال کپور، جیسا کہ میں نے کہا ہے، میرا چہیتا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ گو فکر کی طنز تند اور دل پذیر ہے، اس کی تحریروں میں وہ صفائی، وہ سبک پن اور لطافت نہیں جو کپور کا امتیاز ہے۔ تب گو میں طنزیہ تحریروں سے بے حد لطف لیتا تھا مجھے یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کبھی میں بھی اس تمسخر کے زہر میں بجھی ہوئی برچھیاں معاشرے

میں چلاؤں گا اور یہ کہ بحیثیت ایک چگی باز ادیبوں کی برادری میں تھوڑی بہت روسیاہی میرے مقدر میں بھی لکھی ہے۔ میری افتادِ طبع اس وقت مختلف تھی اور میں سوچتا تھا کہ میں رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی طرح لڑکوں کے لیے مہماتی کہانیاں لکھا کروں گا مگر اب طنز نگاروں کی اس مخصوص نسل کی اتنی قحط سالی کے بارے میں میری تھیوری۔! وہ دنیا کے ہر ادب میں اتنے خال خال کیوں ہیں؟۔ اتنے کہ ان کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ تمام دنیا کے تھیئٹر میں اچھے کلاؤن بہت زیادہ نہیں اور طنز نگار بھی بڑی حد تک ادبی کلاؤن ہیں جو بڑے کرتب بازوں اور استادنٹوں کے حیرت ناک antic کی نقل اور نقالی کر کے ان کے کیے کرائے کی ہنسی اڑاتے ہیں اور اپنی بے چارگی کی ہیئت کذائی پر دوسروں کو ہنسنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سب سے متبرک قانون اور رواجوں، مروجہ نظریوں اور اقدار، دنیا کے بڑے بڑے فاتحوں کی شخصیتوں میں بہت کچھ مضحک ہوتا ہے اور یہ یونہی نہ تھا کہ پرانے شہنشاہ اپنے درباروں میں ایک آدھ مسخرہ ضرور رکھتے تھے جو اپنی چگی بازی سے انہیں آئینہ دکھا سکے اور دوسروں کے لیے اپنے پر تضحیک کا سامان مہیا کر سکے۔ یہ مسخرے ان کے منہ پر ایک خاص ڈھب سے ایسی بات کہہ جاتے تھے جو کوئی دوسرا کہتا تو اس کا سر بھٹے کی طرح اڑا دیا جاتا۔ فرانس کے لوئی (یازدہم؟) کے پاس ایک مسخرہ چیکو نامی تھا اور ظل الٰہی اکبر اعظم کے پاس بیربل اور ملا دوپیازہ تھے جو شہنشاہ سے بھی نہیں چوکتے تھے اور جن کی گستاخیاں اسے خوش کرتی تھیں۔ یہ اسے یاد دلاتی تھیں کہ دوسرے آدمیوں کی طرح اس کی بھی ایک نچلی آنت ہے اور وہ بھی مخصوص ہیومن ہے! اپنے کروفر اور جاہ وجلال کے باوجود۔ کیا یہ سچ نہیں کہ زندگی کے اس عارضی اسٹیج پر جہاں ہم اپنے اپنے پارٹ ادا کر کے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتے ہیں، ان کھیلوں کو پاپائی اور سنجیدگی اور بوجھل متانت سے لینا مضحکہ خیز ہے۔ کیا یہ خودنمائی اور خود آرائی ہنسنے کی چیز نہیں؟ طنز نگار کا مزاح کٹیلا، تلخ اور نیلے تھوتھے میں بسا ہوتا ہے۔ اتنا کارگر کہ شکار کسمسا نہیں سکتا۔ اس کی چگی بازی میں ایک ایسی شیریں ادائی اور لطافت ہوتی ہے کہ تم اسے معاف کر دیتے ہو اور اپنے دل کی تہوں میں اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس کی بات میں صداقت اور حقیقت کا پہلو ضرور ہے۔ اس میں اپنے آپ پر ہنسی اڑوانے کی اہلیت ہوتی ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی خود کا بیرون خانہ سے نظارہ کر سکے۔ وہ، میں سمجھتا ہوں کچھ سنکی، کچھ رواتی، کچھ جھلا سا ہوتا ہے۔ اس سوسائٹی اور سماج کے خلاف ایک قسم

کا کینہ اور بغض لیے ہوئے جس سے اسے محرومی کے سوا کچھ نہیں ملا۔

طنز نگار نارمل نہیں ہوتے۔ ان کے ہاضمے ہمیشہ خراب رہتے ہیں اور جو کچھ وہ کھاتے ہیں انہیں راس نہیں آتا۔ ڈین سوفٹ اکثر بدہضمی کی شکایت کیا کرتا۔ ایلولین کی انتڑیاں کام نہیں کرتی تھیں۔ آوریل بیٹ انتڑیوں کے سرطان سے مرا۔ اچھا ہاضمہ دنیا میں سب کچھ ہے اور طنز نگار دنیا کی مسرتوں اور شادکامیوں سے خالی۔ سارے مقدس قابل احترام دستوروں اور چیزوں کی فاختہ اڑا کر اپنا اپنا انتقام لیتا ہے۔ لیکن بڑی بات یہ ہے کہ وہ خود پر بھی ہنستا ہے۔ ایک قدرتی کلاؤن۔ اپنے وجود میں ایک آرٹسٹ۔ میں نے کہا ایک آرٹسٹ۔ فکر کے متعلق میں نہیں جانتا (پچھلے دنوں وہ لاہور آیا تو میں اس سے پوچھ نہیں سکا۔ ہم چند گھنٹے ہی ایک دوسرے کے ساتھ گزار سکے) مگر حال ہی میں کنہیالال کپور کے مرقعے میں (جو اس وقت لکھا گیا تھا جب وہ زندہ تھا) اس نے بتایا ہے کہ کپور کا ہاضمہ ہمیشہ خراب رہتا ہے اور اسے اپنے سوکھے سڑے ہونے کا شدت سے احساس ہے۔ جو کچھ اس نے کپور کے بارے میں لکھا ہے میں عین مین اپنے پر چپکا سکتا ہوں [''] میں طنز نگاری کی طرف اس وقت آیا (میں نے اس صنف کو اپنانے کی شعوری کوشش نہیں کی) جب میرا ہاضمہ جواب دے چکا تھا۔ ہڈیوں سے گوشت پوست جھڑ چکا تھا اور دنیا کھانے کو آتی تھی۔ مجھ میں غالباً یہ ردعمل ہوا کہ میں دنیا کو کھانے آؤں گا۔ ['']

اب ایسے ابنارمل سے ہوئے لوگ دنیا میں کم نہیں جن کے دل میں انسانی تبرکات، قوم، ملک، مذہب، کانسٹی ٹیوشن، شادی کا پاک رواج اور دوسرے انسانوں کے وضع کردہ قوانین اور رسوم اتنی جڑ نہیں پکڑتے کہ وہ اس کی خاطر انسان اور دیوتاؤں سے آستینیں چڑھا کر نبرد آزمائی کے لیے تیار ہو جائیں یا غیظ وغضب سے منہ میں جھاگ لے آئیں۔ ہم اپنے ملک میں قدرے بزدل، قانون سے ڈرنے والے، قطعی بے وقار قسم کے لوگ ہیں اور اسٹیٹ سے ہماری وفاداری شک اور شبہے سے بالاتر ہے مگر ہم قدرتی چگی باز ہیں۔ ہم ہر ایک اور سب جذبوں پر ہنستے ہیں اور ساتھ اپنے آپ پر بھی۔ اور اگر ہماری ہنسی میں تلخی اور بے حرمتی ہوتی ہے تو یقین رکھو۔ ہمارے ہاضموں کا قصور ہے۔ اس میں ہمارا اصلاً کوئی قصور نہیں۔

اس تھیوری کی وضاحت تو ہو چکی اور اب مجھے اپنے ہم پیشہ کلاؤن فکر کی بات کرنے دو۔

تقسیم ملک کے بعد لاکھوں دوسرے انسانوں کی طرح فکر تونسوی بھارت دیس میں چلے گئے کہ سلامتی اسی میں تھی۔ وہاں جا کر بھی (اور ان کٹھنائیوں کے باوجود جن میں سے وہ گزرے) انہوں نے اپنا دھندا جاری رکھا اور جگت بازی سے باز نہ آئے۔ کپور نے کئی اور کتابیں لکھیں گو اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں وہ ماسٹر جی تھا اور آخر کار کسی ستم ظریف نے اسے موگا کالج کی پرنسپلی بھی سونپ دی۔ فکر تو تھا ہی ایک پیشہ ور طنز نگار اور کسی چیز کو سلیقے سے کر لینے میں بالکل نا اہل۔ ایک معصوم، بےعمل، گھامڑ سا شخص۔ وہ لکھتا نہیں تو بھوکوں مرتا۔ اس نے اپنے آپ کو کئی اخباروں سے وابستہ کیا جن میں اس کے کالم چھپنے لگے اور کئی اردو زبان کے میگزینوں میں اوپر تلے مضمون دیے۔ قدرتی فاقوں سے بچنے کے لیے اسے لازمی طور پر بسیار نویسی اور زود نویسی اختیار کرنی پڑی۔ اب اکثر پڑھنے والوں میں یہ عام تاثر ہے کہ بے تحاشا لکھنے سے لکھنے کی کوالٹی کو گزند پہنچتا ہے اور ایک طرح اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ اگر کسی لکھنے والے میں جوہر ہے، اگر وہ جینوئن ہے اور اپنے پیشے سے دلی لگاؤ رکھتا ہے تو روزانہ اور باقاعدہ لکھتے رہنے سے اس کے قلم میں پختگی اور نکھار آتا ہے اور اس کی حسیات زیادہ تیز ہو جاتی ہیں۔ غالب نے اپنے کئی خطوں میں مشق سخن پر یونہی زور نہیں دیا تھا۔ انگریزی کے شہرہ آفاق مزاح نویس پی۔ جی۔ وڈ ہاؤس نے، جو نوے سال سے اوپر ہو کر مرا، اپنی زندگی میں سو کے لگ بھگ کتابیں شائع کیں مگر آخری دم تک اس کی اپج برقرار رہی۔ اس کی ایجاد و اختراع کی قوت میں کوئی کمی نہ آئی۔ اس کا مزاح باسی کڑھی نہیں بنا اور ہر اگلی کتاب پہلی سے بہتر ہوتی تھی۔ جے۔ بی پریسلے اور ایولن واہ کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ستر اور پریسلے نے چالیس کے لگ بھگ کتابیں لکھیں۔ اور اخباروں اور میگزینوں کے لیے بے شمار سیاسی، ادبی اور تنقیدی مضامین لکھے۔ ان کی نگارش کو بگڑنا تو کیا تھا اس میں زیادہ روانی، سلاست اور قوت آتی گئی اور دونوں کے آخری دور کے ناول بالعموم ان کے شاہکار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مشہور مختصر افسانہ نگار، سوانح نویس اور نقاد وی۔ ایس۔ پریچٹ نے اپنے ایک انٹرویو میں نئے لکھنے والوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''ہر روز کچھ نہ کچھ ضرور لکھو خواہ اس کے لیے تمہیں اپنے لکھنے کی ڈیسک یا ٹائپ رائٹر کی طرف بادل نخواستہ گھسٹ کر کیوں نہ جانا پڑے''۔ خود ہمارے ادب میں رتن ناتھ سرشار، ڈپٹی نذیر احمد اور عظیم بیگ چغتائی کی مثالیں ہیں جنہوں نے بسیار اور زود نویسی میں حد کر دی۔ اس مفروضے

کو اگر کئی لکھنے والوں کے لیے سچ بھی مان لیا جائے (کرشن چندر کی مثال سامنے آتی ہے مگر اس کے فن کے زوال کے اسباب کچھ اور تھے نہ کہ بسیار اور زود نویسی) تو مزاح اور طنز لکھنے والوں پر صادق نہیں آتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پچاس کے پیٹے میں آ کر ان کا دماغ چل جائے، وہ اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ فکر کی زود اور بسیار نویسی حقیقتاً اس کے لیے سود مند ثابت ہوئی۔ اس کی ظرافت کے بھالے کی انی اور نوکیلی ہو گئی۔ صفائی بیان اور موضوعات کے تنوع میں وہ اور آگے بڑھا۔ فکر نے بھارت میں جا کر بہت کچھ لکھا مگر اس عرصے میں اس کی چند ایک چیزیں جو مجھے پڑھنے کو ملیں ان سے ظاہر تھا کہ اس کی تحریروں میں فائن نیس آ گئی ہے اور کم فقروں میں وہ بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ تونسوی فکر کی جولانیوں نے فی الواقع مجھے مسرت دی۔ اس کا نام اب کنہیا لال کپور کے ساتھ لینے میں مجھے کوئی عذر نہ تھا اور کئی لحاظ سے فکر کپور سے آگے تھا، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ عمر کے ساتھ ساتھ کپور کی شگفتگی اور چٹکی بازی پھیکی پڑتی گئی۔ پرانی کاٹ جو مزہ دے جاتی تھی، وہ چلبلا پن جو بے بس شکار کے علاوہ دوسروں کو خوش کرتا تھا، یہ سب اس سے چھن گئے۔ کنہیا لال کپور اب مر چکا ہے اور بھارت میں جہاں تک میں جانتا ہوں، اردو زبان میں لکھنے والا تنہا طنز نگار فکر تونسوی ہی رہ گیا ہے۔

ادب لطیف اور سویرا میں لکھنے کے زمانے میں (۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء) تک میں نے راجندر سنگھ بیدی، دیوندر ستھیارتی، کرشن چندر، کنہیا لال کپور اور دوسرے بہت سے رائٹرز کو دیکھا۔ بیدی اور کرشن چندر سے تو میری کچھ گفتگو بھی ہوئی۔ میں ان کے گلیمر سے مرعوب تھا۔ فکر تونسوی کو میں نے نہیں دیکھا اور اگر مکتبہ اردو میں کبھی بیٹھے دیکھا بھی ہوگا تو کیسے پتہ چلتا کہ یہ فکر تونسوی ہے۔ کئی سال بعد جب اس نے مجھے دلی کے ایک رسالے 'شاہکار' کے لیٹر پیڈ پر دو تین خط لکھے تو ہم ان دیکھے دوست بن گئے۔ اس کے خط نے مجھے حیران بھی کیا اور بے حد خوش بھی۔ فکر کو کیوں کر معلوم ہوا کہ میرا وجود تھا اور میں طنز لکھتا تھا۔ بات یہ تھی کہ آرویل کی "۱۹۸۴" سے متاثر ہو کر میں نے ۱۹۵۰ء میں ایک فینٹسی ۲۰۱۱ء (بیس سو گیارہ) لکھی۔ اس وقت میں کراچی میں چاکی واڑہ کے محلے میں ایک بدبودار تنگ و تاریک فلیٹ میں رہتا تھا اور نسبتاً جوان تھا (اگرچہ سب مجھے بوڑھا آدمی سمجھتے تھے)۔ میں نے بیس سو گیارہ غصے سے ایک زہر بجھے قلم سے لکھی۔ کہنے کو فینٹسی مگر دراصل اس وقت کے ملکی حالات، سیاسی منظر اور معاشرت پر ایک طنز۔ زبان و بیان کی خامیوں کے باوجود مجھے

کچھ اس قسم کا احساس تھا کہ میری کتاب اچھی ہے۔ تند اور تیز زہریلی۔ کیونکہ ایک طرح سے کتاب نے خود اپنے کو لکھا تھا۔ اسے کون چھاپے گا؟ میں نے اس کی کتابت خود کرائی (ایک صفحے کی کتابت کاتب دو روپے لیتا تھا) اور کتابت شدہ مسودہ اپنے دوست مکتبۂ جدید کے چودھری رشید احمد کے حوالے کیا۔ اسے کتاب گھر مکتبہ سے چھپوانے کے لیے آمادہ کرنے کے لیے میں نے پیش لفظ میں اپنے ناول کا انتساب ناشر کے نام کیا ورنہ سب ناشروں کی طرح اس بے چارے کو یہ معلوم نہ تھا کہ کتاب کے اندر کیا ہے۔ جوں توں میری پہلی کتاب بیس سو گیارہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر چھپ گئی۔ میں مسرت کی ساتویں سیڑھی پر تھا اور میرے باپ نے اپنے ہونہار بیٹے کی چار پانچ سو جلدیں ناشر سے خرید کر اپنے احباب اور جاننے والوں میں مفت تقسیم کیں۔ کتاب کسی کی سمجھ میں نہ آئی اور تبصرہ نگاروں نے برملا کہا کہ مصنف کو اردو زبان نہیں آتی۔ مجھے آتی بھی نہیں تھی اور میں لکھنا سیکھ رہا تھا۔ حاصل کلام یہ کہ میرے کہنے پر ناشر نے اس کی ایک جلد کنہیا لال کپور کو جالندھر بھیجی۔ تب کتابیں اور رسالے ایک ملک سے دوسرے ملک میں سہولت سے آتے جاتے تھے (اب یار لوگوں نے اس تکلف کو اٹھا دیا ہے)۔ کپور بھانپ گیا کہ میں نے فینٹسی کی اوٹ میں کیا کہا ہے۔ وہ کتاب کے بارے میں پر جوش تھا اور اس نے میرے ناشر کو خط میں لکھا کہ بیس سو گیارہ اردو زبان میں پہلی معاشرتی اور سیاسی طنز ہے اور کاش وہ اس کا مصنف ہوتا۔ مجھے گویا اپنی محنت کا صلہ مل گیا۔ اس بات کا رنج نہ رہا کہ میری بات بیشتر پڑھنے والوں کے پلے نہیں پڑی اور وہ میری انگریزی اردو پر دانت پیسنے اور پیچ و تاب کھانے کے سوا کچھ نہیں کر سکے۔ کپور جب فکر سے ملا اس نے اس سے بیس سو گیارہ کا ذکر کیا اور کتاب پڑھنے کے لیے دی۔ اس طرح فکر کو اس ہیچمداں ہستی کا پتہ چلا۔ اور جب اسے 'شاہکار' کے لیے طنزیہ اور مزاحیہ چیزوں کی ضرورت تھی اس نے اس بارے میں کسی کی معرفت خط لکھا۔ ہمارے درمیان خط و کتابت ہونے لگی۔ میری دو تین چیزیں اس نے 'شاہکار' میں شائع کیں اور مجھے یاد ہے کہ ان میں قرۃ العین حیدر (جن کے فن کا میں مداح ہوں) کے ناول 'میرے بھی صنم خانے' کی ایک پر لطف پیروڈی 'میرے بھی جم خانے' کے عنوان سے تھی۔ بعد میں میں نے پیروڈی کو اپنی خاص صنف بنایا اور بڑے بڑوں کا ان کے اسلوب اور طرز بیان کی نقالی کر کے منہ چڑایا۔ مگر میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ 'میرے بھی جم خانے' سے بڑھ کر کامیاب میں نے اور کوئی پیروڈی کبھی نہیں لکھی (افسوس وہ کھو گئی۔ ہو گی تو شاہکار کی فائلوں میں کہیں

دبی ہوگی)۔

انگریزی زبان کی ایک مثل تم نے سنی ہوگی جس کا مطلب ہے ایک ہی پر و بال کے پرندے اکھٹے ایک ڈار میں اڑتے ہیں۔ فکر میرے لیے ایک ایسا پرندہ تھا۔ ہم دونوں چگی باز تھے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس نے مجھے ڈھونڈ نکالا اور میں نے اس کو۔ ایک تیسرا فیلو چگی باز کنہیا لال کپور تھا۔ اور میرے دل میں متعدد بار یہ خواہش کروٹ لیتی رہی کہ میں اسے خط لکھوں۔ وہ اس سے خوش ہوگا اور ہم ایک دوسرے کا حال نامہ و پیام کے ذریعے لیتے رہیں گے مگر خانہ کاہلی خراب۔ آج لکھوں کل لکھوں۔ وہ خط نہ لکھا گیا اور میں اسے نہ لکھنے پر کفِ افسوس ملتا ہوں۔ اس کا مجھے اب تک ملال ہے۔ کپور اپنی شیریں بولی بول کر ڈار سے چھٹ گیا۔ اب وہ عالم بالا میں ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے وہاں ابھی تک ڈاک نہیں جاتی۔ گو بھارت کو فرار کے بعد تونسہ شریف کے فکر نے الم غلم بہت کچھ لکھا اور بہت سے پاپڑ بیلے۔ اس کی بہت کم چیزیں میری نظر سے گزریں۔ اس کی وجہ ہم سب جانتے ہیں۔ فکر اور کپور کی جو چیزیں بھولے بھٹکے یہاں رسالوں میں چھپ جاتی تھیں وہ میں ضرور پڑھتا تھا۔ وہ میرے ہی لیے تو لکھتے تھے اور ہم ایک دوسرے کی زبان جانتے تھے۔ ۱۹۷۹ء کے اوائل میں میرا ایک پنجابی لکھاری پروفیسر دوست بھارت گیا۔ دہلی میں فکر تونسوی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ غالباً ملاپ کے اخبار کے دفتر میں جس سے فکر بطور ایک کالم نویس منسلک ہے۔ فکر نے میرا حال چال پوچھا اور یہ کہ میں آج کل کہاں ہوں، کیا کرتا ہوں، زندہ ہوں یا داغِ مفارقت دے گیا۔ پروفیسر دوست کی یقین دہانی پر کہ میں ابھی مرا نہیں، اس نے مجھے دینے کے لیے اپنی کتاب 'فکر نامہ' میرے دوست کو سونپی۔ فکر نامہ اس کی پچھلے برسوں میں لکھی ہوئی طنزیہ تحریروں کا انتخاب ہے جو حال ہی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے ڈاکٹر خلیق انجم کے پیش لفظ اور کرشن چندر مرحوم کے تعارف سے سج کر منظر عام پر آیا تھا۔ یہ کتاب جسے فکر نے اپنے نام انتساب کیا ہے (اس مصرعے کے ساتھ...اپنے پہ اعتماد ہے۔۔غیر کو آزمائے کیوں) مجھ تک بڑے بکھیڑوں سے پہنچی۔ اس کے طلائی لیف پر رواں دواں خط میں یہ عبارت تھی۔ ''محمد خالد اختر کی نذر۔ نہ جانے میں تمہیں کیوں ہمیشہ اپنا سمجھتا رہا ہوں۔ فکر تونسوی''۔ میری طبیعت اس کے اس پیغام پر جوش کیوں نہ مارتی۔ فکر تونسوی، میں بھی تمہیں ہمیشہ اپنا سمجھتا رہا ہوں مگر جانتا ہوں کہ کیوں ہم دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ایک پر و بال والے پنچھی ہیں۔ اپنے پر ہنسنے

والے۔ متبرک چیزوں کی ہنسی اڑانے والے۔ اپنے اندر کے زہر سے گردو پیش کی ریاکاری، ملمع سازی اور جھوٹ کا کچھ مداوا کرنے والے۔ ہم ادب کے سرکس میں فیلو کلاؤن ہیں۔ فکرنامے کے دل پذیر مضامین کو اسی روز میں نے پڑھ ڈالا۔ ان مضامین میں تازگی، ندرت اور موثر طنز تھا۔ وہ لوگ جو لطافت اور آرٹسٹری سے سچ کہنے اور سچ لکھنے سے نہیں جھجکتے، کتنے کم ہیں۔ اور فکر میں ایک اور بات تھی۔ سب سے زیادہ وہ خود اپنے آپ پر ہنستا تھا۔ اسے اپنی ذات کا کچھ ادب لحاظ نہیں تھا۔

اس مرقع کے اختتام سے پہلے میں پڑھنے والے کو یہ بتانا چاہوں گا کہ اس کے فن میں جو تمازت، بصیرت اور نکھار ہمیں نظر آتا ہے کیوں کر اور کہاں سے آیا؟ میرا خیال ہے لکھتے لکھتے اور بے تکان لکھتے رہنے سے پہلے وہ پیدائشی چگی باز اور طنز نگار تو تھا ہی۔ ان کٹھنائیوں نے جن میں سے وہ گزرا، جو سیاسی معاشی بصیرت اس نے حاصل کی انہوں نے اس کے مزاح کو چمکایا اور مشق سخن نے اس کے اسلوب کو سنوارا اور جلا بخشی۔ جب تک تم خود اپنی زندگی کو اپنی شادمانی، اپنے حزن کے ساتھ نہیں جیتے تم زندگی کے بارے میں کیا لکھ سکتے ہو۔ فکر بیتی کے مضمون میں اس نے برسر بازار اپنی درگت بناتے ہوئے معاشرے کے ایک عام، ڈرپوک، بوکھلائے ہوئے شخص کو (جیسا کہ ہم میں سے بیشتر ہیں اور مائیں ایسے لعل پیدا کرتی ہیں) آڑے ہاتھوں لیا ہے لیکن اس انداز سے کہ ہم ہنستے بھی نہیں اور روتے بھی نہیں اور متبرک معاشرت اپنی منافقت اور بھیانک پن سے کریہہ اور بدوضع دکھائی دینے لگتی ہے جیسی کہ وہ ہے۔ اپنے جنم سے، پنر جنم اور دوسرے مضامین میں اس نے بغیر پاس لحاظ اپنی ہنسی اڑائی ہے۔ جیسے وہ کہتا ہو دیکھو لوگو میں کلاؤن ہوں کہ نہیں۔ اس کے نزدیک فکر تونسوی سراسر مضحکہ خیز شے ہے۔ لیکن فکرنامے کے مضامین پڑھ کر جو تاثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ فکر تو مضحکہ خیز ہے ہی۔ وہ مقدس رواجوں کا معاشرہ جس میں وہ سانس لیتا ہے اور بھی حد درجے مضحکہ خیز ہے۔ مضحکہ خیز اور گھناؤنا بھی۔ مجھے پڑھتے ہوئے کئی بار اپنے کلاؤن کے رویے کا احساس ہوا اور سچ یہ ہے کہ ہنسنے اور رونے میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں۔ چارلی چپلن کی کامیڈیز، دراصل ٹریجڈیز ہیں۔ اپنی جوانی میں میں نے چارلی چپلن کی ایک فلم 'مالیوار' لندن میں دیکھی اور جب سارا ہال اس بے مثال کلاؤن کی بدحواسیوں پر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا، میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کلاؤن کی سادگی، بے چارگی، بوکھلاہٹ۔ کیا میری حالت

اس اوٹ پٹانگ بے پرواد نیا میں اس سے مختلف تھی۔اوہ.....انسان کا مقدر۔۔۔!

فکر سے خط و کتابت تو تھی مگر مجھے گمان تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ میں ہندوستان کبھی نہیں جاسکوں گا اور وہ پاکستان نہیں آئے گا۔واپڈا سے اپنے بورنگ جاب سے پنشن پانے کے بعد میں لاہور سے اپنے شہر بہاول پور چلا آیا جہاں میرا آبائی گھر تھا۔دسمبر ۱۹۸۰ء میں، میں اپنے جگری دوست ظہور نظر کے ساتھ کچھ دن کے لیے لاہور گیا تو ہمیں پتہ چلا کہ فکر لاہور میں ہے اور نقوش والے محمد طفیل کی میزبانی کے مزے اڑا رہا ہے۔فکر سو بکھیڑوں سے ویزا حاصل کر کے پاکستان پہنچا تھا۔ظہور نے نقوش کے دفتر میں فون کیا اور محمد طفیل نے بتایا کہ فکر تونسوی صاحب فی الواقع وارد ہو چکے ہیں اور اس وقت اس کے دفتر میں موجود ہیں۔پھر ظہور اور فکر کی فون پر باتیں ہوئیں۔وہ ایک زمانے میں لنگوٹیے تھے۔اس لیے ایک دوسرے سے بے تکلف ہے ظہور نظر نے فکر کی خوب ایسی تیسی کی اور ایسے پھکڑ بولے جو چھاپے نہیں جاسکتے۔ پھر ہم بھاگم بھاگ اردو بازار میں نقوش کے دفتر پہنچے تو فکر تونسوی وہاں موجود تھا۔ بے استری کے گھسے پٹے سوٹ میں، دوہرے بدن کا جھڑوس آدمی۔فراخ ماتھا بے حد موٹا، پکوڑے سی ناک، دانت کچھ نکلے ہوئے۔اسے دیکھ کر میرا خیال گھوڑوں کی طرف چلا گیا جو مجھے اچھے نہیں لگتے اور جنہوں نے مجھے کئی بار گرانے کی کوشش کی ہے۔وہ ریلوے یا میونسپلٹی کا کوئی بابو لگتا تھا جس کی ایک دھرم پتنی تھی اور آٹھ بچے۔اور ایک مجمعے میں قطعی بے وقعت۔عام سا ہوا گھامڑ سا آدمی۔ اسے دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔وہ اٹھ کر ظہور نظر سے لپٹ گیا۔مجھ سے بڑے تپاک اور محبت سے ملا۔اس نے مجھے غور سے دیکھا اور شاید سوچا کہ میں ایک پرندے سے مشابہہ ہوں جس نے کسی نہ کسی طرح ایک سیاہ پتلون اور ٹوئیڈ کوٹ میں اپنی راہ پالی ہو۔ ہم باتیں کرنے لگے۔اس نے مجھ سے کہا کہ میری تحریریں پڑھ کر اس پر رعب طاری ہو جاتا ہے۔اس نے یہ نہیں پوچھا کہ میری شکل وصورت، بال و پر نُچے پرندے کی سی کیوں ہے؟ میرا خیال ہے اس نے قیاس لگا لیا ہوگا کہ یہ ہیئت کذائی خراب ہاضمے کی مرہون منت ہے اور میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔اس پہلی بھرپور ملاقات کے بعد ہم ایک آدھ بار ہی کھل کر مل سکے۔محمد طفیل کے دولت کدے سے قتیل شفائی اسے اپنے گھر لے گیا۔عطاء الحق قاسمی اور گلزار وفا چودھری کی شیزان میں دی ہوئی پارٹی میں اس نے کوئی خاص بات نہیں کی۔اور مجھے یہ تاثر ہوا کہ میری طرح وہ بھی روکھا پھیکا آدمی ہے جسے چمک دار باتیں کرنا

نہیں آتیں۔ شیزان سے نکل کر وہاں چلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اس وہ اپنی دائیں ٹانگ کو ہلکا سا گھسیٹ کر چلتا ہے۔ اس نے بتایا کہ چند سال پہلے اس پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا اور وہ مرتے مرتے بچا۔ میں نے دل میں کہا ہم کلاؤن شتابی سے نہیں مرتے۔ جب ہم لاہور سے چلے فکر راول پنڈی میں تھا اور پاکستان میں اس کے قیام کے دوران پھر ہم نے ایک دوسرے پر نگاہیں نہ ڈالیں۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ ہمارے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ بہاول پور آنے کے کچھ روز بعد خبر ملی کہ فکر کو لاہور میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ تفصیل کا ہمیں پتہ نہ چل سکا۔ پندرہ بیس روز بعد اس کا ایک ایروگرام خط آیا اور مجھے معلوم ہوا کہ فکر صحیح سلامت اپنی دہلی کو لوٹ چکا ہے۔

اس طرح ہم ملے اور جدا ہوئے۔

دو چگی باز کلاؤنوں نے اپنی بے ہیئتی کے باوجود ہار نہیں مانی۔

اپنے آپ اور دوسروں پر ہنسنے سے باز نہیں آئے۔

□□□

ماخذ: افکار، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۳ء

محمد خالد اختر (م: ۲ فروری ۲۰۰۲ء) اردو مزاح نگاری کا ایک اہم نام ہے۔ ابن انشاء، خالد اختر کے فن کے متعلق بیان کرتے ہیں:

> ''محمد خالد اختر کو پڑھنے والا اکثر یہ بھول جاتا ہے کہ وہ اردو پڑھ رہا ہے۔ اس میں انگریزی الفاظ کی بھرمار بھی نہیں ہے لیکن جملوں کی ساخت سراسر انگریزی ہے۔ شروع شروع میں یہ انداز غریب اور اکھڑا اکھڑا معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں اس میں بانکپن کا لطف آنے لگتا ہے۔''

زیر نظر خاکہ بھی انشا جی کی مذکورہ بالا تعریف پر پورا اترتا ہے۔ [مرتب]

•••